

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

مسلم ہونے اور تخریبِ اسلامی کا علمبردار اور دعوتِ حق کا گواہ بننے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھتے ہی آدمی خدا سے واحد کے سوا سارے آلہہ و ظواغیت کا انکار کر دے۔ سب سے مشکل کام نفس کے اللہ کا انکار ہے۔ پھر بیوی بچوں اور خاندان کے الہوں کا انکار ہے۔ پھر ماحول کی رسمیات کے پورے مذہبِ اسراف و بدعت سے انکار ہے۔ جو شخص راہِ حق میں خلوص و صدفی دلی سے نکلے اُس کے لیے راستہ یہی ہے کہ وہ مختلف الہوں کی لازم کردہ شریعتِ رسوم سے بغاوت کے لیے تیار ہو، ورنہ جسے ہر طرف بنا کے رکھنی ہو، اس کے لیے دین کی سر بلندی کا کام کرنے والوں میں آگسٹا بعد میں خود اُسے پریشان کرے گا۔

چنانچہ سید احمد شہیدؒ نے اپنی تخریب کا آغاز ہی اصلاحِ رسوم اور اندسارِ بدعات سے کیا تھا۔ اسی طرح مولینا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اس میدان میں بڑا کام کیا۔ آج بھی جس کسی کو دین کی خدمت کرنی ہے، اُسے رسوم و بدعات کی زنجیریں توڑنی ہوں گی اور اس کام کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے ہوتا ہے۔

ہم پہلے ہمارے دور بادشاہت نے باہر کے اثرات لاکے ڈالے۔ پھر ہندو اور مسلمانوں کے رواج ہماری تقادیب میں گھس گئے اور اب مغربی معاشرہ و تمدن کے اثرات راستہ بنا ہے۔ تمام غلط بیرونی اثرات سے نکلنے کے لیے ایک مہم ضروری ہے اور شاید شادی بیاہ کے معاملے میں سب سے پہلے اصلاحی کام ہونا چاہیے۔

اس معاملے میں معاشرے کے سامنے سر جھکا دینے کے بعد پھر آپ تبلیغی جماعت کی طرح کا کام

کہہ سکتے ہیں، طاغوتوں اور منکرات کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اقامتِ دین کا بھرپور کام نہیں کر سکتے۔

محترم قاضی حسین احمد قسیم (کالعدم جماعت اسلامی) نے پچھلے دنوں ایک تقریر میں شادی بیاہ کو فضولیت سے پاک کرنے کے جو اصولی دعوت کارکتوں کو دی ہے، اُس کا علم ہوتے ہی مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ میں جہاں ایک طرف شادیوں اور ولیموں کے نئے پرشکوہ ڈراموں کو دیکھ دیکھ کر اتنا دگر تھکا کہ کئی بار خیال کیا کہ کسی شادی میں سرے سے شرکت ہی نہ کی جلتے۔ اور دوسری طرف جب میرے دل میں تحریک کے بہانہ و دور کی یہ اجتماعی آئینگ جاگ اُٹھی کہ جس طرح دوسرے معاملات میں ہمیں اس بگڑے ہوئے معاشرے کے گندے سمندر سے ایک نئے پاکیزہ جزیرے کو اُبھارنا ہے، اسی طرح شادی بیاہ کے معاملے میں بھی نئے طریقے اختیار اور رائج کرنے ہیں۔ جس دینی تحریک نے ہمیں بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ آئندہ وہی ہمارے نئے تعلقات اور رسومات کی بنیادیں فراہم کرے گی۔ اس سلسلے میں کچھ کام بھی ہوا، مگر پھر ماحول نے وہ وہ چکر دیتے کہ سب کچھ فراموش ہو گیا۔ اور ہم نے معاشرے میں اتنی ہی متماد پیدا کرنے کے بجائے رسمیات کے آگے ہنٹھیا پڑا ل دیتے۔ سو میرے لیے قاضی صاحب کا ایک ذرا سا جملہ سوتے ہوئے احساسات کو جگانے کا بہانہ بن گیا۔ لطیف کے طور پر کہنا ہو تو کہہ لیجیے کہ ”قاضی باقاضی می سازد“۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب

سے ہمارے حلقے سے وابستہ لوگوں نے ایسی بھی مثالیں قائم کی ہیں کہ دو بہا صاحب مردانہ طلائی زیورات سے مرصع ہو کر فخریہ لائے اور لڑکی والوں کے متوسط الحال سے خاندان سے گن گن کر اسبابِ جدید کے مطالبے پورے کرانے لگے۔ ایسے تماشے بھی دیکھے کہ لڑکی والوں کے ہاں کسی بند کو ٹھہری ہیں محض چھوٹی ڈھولک بچ رہی تھی، مگر عجب بارات کی آمد کا وقت ہوا تو لڑکیوں نے دوڑ بھاگ کر اُسے چھپانے کی کوشش کی کہ اسلامی طرز کی بارات ولے کیا راتے قائم کریں گے، مگر ستم یہ ہوا کہ اس اسلامی بارات میں سب سے پیش پیش بے پردہ عورتوں کی ایک ٹولی نکلی اور اُن کی سرغند صاحبہ نے اوپر پہنچ کر زور شور سے خود گانے بجانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ (سنہ۔ ص ۷)

کو بہت سے تعیناتی خطوط موصول ہوئے اور کارکنوں میں نہایت اچھا احساس اُبھرا۔

میرا خیال یہ ہے کہ اب ہمیں اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے اور کسی بالائی مشاورت میں اپنے اصول و معیار دین کے مطابق مگر اعتدال پسندانہ طریق سے طے کر لینے چاہئیں۔ اور پھر امید کرنی چاہیے کہ ہمارا کوئی رفیق یا حامی ان کا خلاف ورنہ نہ کرے گا۔

آج کل جتنی چیزیں میں نے غلط شکل میں ہوتی دیکھی ہیں سب کا اندر بڑے بڑے "اساطین" تک نے یہ بیان کیا کہ کیا کریں اب لڑکے نہیں ملتے، یا بیوی یا برادری نہیں راضی ہوتی ماس کے معنی یہ ہیں کہ ایسے لوگ نہ اپنے گھر کے لیے کبھی تو کام (لیڈر) بن کے رہے نہ انہوں نے بیوی بچوں کی مایوسی برس میں کوئی تربیت کی اور نہ اپنی برادری پر اپنی اخلاقی فوقیت کا کوئی مسکے بٹھایا۔ دوسرے معنوں میں باہر تو وعظ کہے جاتے رہے، مگر اندر شیطان بدعات و رسمیات کا محاذ بناتا رہا۔ ہمارے دوست اپنے گھروں کے اندر اپنے نظریات و مقاصد کے خلاف ایسے تباہ کن محاذ بنتے اور پھیلنے ہوئے دیکھتے رہے اور کبھی انہیں احساس نہ ہوا کہ بہت سے آئینہ و طواغیت ان کو ان کے اپنے گھر میں شکست دینے کے سامان کر رہے ہیں۔ اور آج تو شیطان مغربین کی بنیاد کا پالیسی ہی یہ ہے کہ عورتوں کو ہنپٹا کر کے اور بچوں کو تفریحات کی ٹافیاں کھلا کر اور جوان لڑکوں اور لڑکیوں کو فحاشی و لذتیت کی ہیروئن کا عادی بنا کر مسلم گھروں کے ان قلعوں کو توڑ دیا جائے جن کے فراہم کردہ تحفظ کی وجہ سے اسلامی تہذیب کے آداب و شائستگی نہ کسی نہ کسی طرح اب تک زندہ چلے آ رہے ہیں۔ نیز گھروں میں بزرگوں، خصوصاً اسلامیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ماؤں، دادیوں، نانینوں اور چھوٹی بیویوں کو اس حد تک بے بس کر دیا جائے کہ وہ نصیحت کرنا تو کجا، زندگی کے مشکل مرحلوں کو جوڑا لے

لے مجھے اس تحریر کو لکھنے کے دوران میں یہ معلوم کر کے اور مرت ہوئی کہ ہمارے رفقاء نے اصلاح سوال کے لیے ایک کمیٹی قائم کر دی ہے جو اپنی تجاویز مرتب کر کے دے گی۔ آنوی فیصلہ جو کچھ ہوگا، میں اس کا ساتھ دوں گا۔ مگر اس وقت تو میں یہ تحریر بڑی عازم لکھ چکا ہوں، اور میرے خیال میں کوئی بات خلاف اسلام اس میں نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ تغیرات و ترمیمات میں دوسروں کی رائیں مجھ سے بہتر ہوں (لافہ رھی)

کے ہمارے طے کرنے کے لیے کچھ غلط حرکات کو دیکھ کر خاموش بھی رہیں اور طنز و تمسخر بھی برداشت کریں۔

میرے سامنے جب پہلے پہل کراچی کی بعض دولت مند تاجروں کی طرف سے شادی بیاہ کے لیے طے شدہ ضابطے آئے اور ان ضابطوں پر عمل بھی ہونے دیکھا اور سنا تو مجھے صدمہ ہوا کہ جو کام ہمارے کرنے کا تھا اور زیادہ معیاری اور بہتر طور پر کرنے کا تھا اس میں ایسے دوسرے لوگ باذی لے گئے جو دنیا دار کہلاتے ہیں۔

اپنے دل بھی خال خال مثالیں ایسی اُبھریں کہ انہیں دیکھ کر دل سے بے اختیار دعائیں نکلیں، مگر ایک تو وہ شاذ نہیں، دوسرے ان کی غمب کو اس پر محمول کیا گیا کہ عزیز لوگ ہیں، حالات بہتر ہوتے تو یہ بھی سب کچھ کر گزرتے۔ مگر میں اپنے بعض دوستوں اور رفیقوں کو جانتا ہوں کہ وہ اصولاً اور مسلکاً ایک خاص طرز پر سوچنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہمارا سرمایہ افتخار اور ہمارے لیے نمونہ ہیں۔

شادی بیاہ کے سلسلے میں منزل اول رشتے کی تلاش ہوتی ہے۔ لڑکا اگر پیسے والا ہو اور مشرق وسطیٰ میں تسیال سونا رکھنے والے ممالک نے کتنے ہی ان پڑھ اور بد صورت لوگوں کو دولت مند بنا دیا ہے) تو ماں بہنیں چراغ لے کر کسی ایسی چاند سے کھڑے کے تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں جس کے پیچھے پیچھے دولت کی ندی بھی بہتی چلی آئے۔ کہیں ان پڑھ لڑکوں سے ایم اے پاس لڑکیوں کا

لے اس مادہ پرست اور جسم پرست اور چہرہ پرست معاشرے میں سارا حسن بال اور کھال اور خدو خال تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ کتنے ہی سادہ اور سادہ لے چہروں کے پیچھے خوش اخلاقی، دفا شعاری طاعت گزارہ اور حفظِ عصمت و ناموس کا ایک خزانہ محسن مخفی ہوتا ہے۔ ایک محسن ننگا ہونے کے لیے عارضی سامان فریب ہوتا ہے، دوسرا حسن ساری زندگی کو ٹپوڑ بنا دیتا ہے، مگر بگڑے ہوئے سطحی فزوق حسن کو تبدیل کون کرے۔

جوڑ لگا دیا جاتا ہے، کہیں بد صورت فوجرانوں سے انتہائی نرم و نازک لڑکیاں وابستہ کر دی جاتی ہیں۔ چھریہ ستم بھی ہوتا ہے کہ پینتالیس سال کا مرد کسی ۸ سال کی لڑکی کو شکار کر لے جاتا ہے اسی طرح لڑکی والے بھی یہ دیکھیں گے کہ لڑکے کے پاس پیسے وافر ہے، ڈاکٹری، انجینی، اعلیٰ سرکاری عہدہ یا کوئی بڑا بزنس ہے، الگ گھر ہے، اس نندوں سے ترساقہ نہیں پڑے گا وغیرہ حالانکہ سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کوئی لڑکا یا لڑکی یا ان کے گھرانے تحریر کی لحاظ سے یا کم سے کم دیناری اور پردہ داری کے لحاظ سے کیسے ہیں۔ باقی ساری چیزیں علی الترتیب بعد میں دیکھنے کی ہو سکتی ہیں۔ اگر پہلی شرط معیاری طور پر پوری ہو تو دوسری ساری ضروریات سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ گزربسر کے کم سے کم انتظامات اور عمارت و تعلیم کے توازن و تناسب کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔

حال یہ ہے کہ معاشرہ میں شادی مارکیٹ گو یا دہر قایم کے شناس یا دارالرقیقین کی مانند ہے کہ نوٹیاں قطار در قطار کھڑی ہیں، دیکھیے، ٹٹولیے اور بھاؤ تاؤ کر کے مال منجھالیے۔

تخریب اسلامی نہ اس قسم کی منادی سے نفرت کرتی ہے۔ اسلام اگر معیار ہو گا تو اس کی سوئی گھوم کر خود تباہے گی کہ امکانی صورتوں میں سے کدھر کا رخ کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں ان ستمے جعلی معیاروں کے ساتھ ساتھ خاندانی اور نسلی حد بندیوں کی پرستش کرنے والے بھی موجود ہیں۔ چلے لڑکی ساری عمر جہنم میں رہے یا لڑکا گھڑ کی فضا کے درد کا درمان آرزو گری میں تلاش کرے، یا تعلیمی اور معاشی لحاظ سے آپس میں کبھی بات نہ بنے، ہر بھیرے مقررہ کو بھومیں دو افراد کو جو تنہا ضروری ہے۔

پڑائی جاہلیتوں میں سے ایک جاہلیت یہ کاہ فرما ہے کہ رشتے طے کرنے سے لے کر، جو پڑانے حلقوں میں اب بھی بچپن سے طے ہو جاتے ہیں، شادی اور اس کے سارے مقتضیات تک کو اندھا دھند طے کرنا بڑوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے، اور ان کے فیصلے گویا ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے سے ہوتے ہیں۔ کسی مرحلے پر بچوں سے کچھ پوچھنا، مشورہ لینا یا کسی واسطے سے ان کا عندیہ معلوم کرنا تو بالکل خارج از بحث ہوتا ہے۔ مائیں جو اولاد کے رجحانات نسبتاً

زیادہ جان لیتی ہیں، وہ اقل قبول نہیں سکتیں اور بولیں تو لڑائی جھگڑے بلکہ مار دھاڑ کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کو روایت کی گند چھری سے ذبح ہوتے ہوئے آنسوؤں بھری آنکھوں سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ ان کے سامنے جاہلی رواج کا قصائی چھری پھیر دینا ہے۔

بدقسمتی سے اس طریقے کو شرعی سمجھ لیا گیا ہے کہ ماں باپ جو چاہیں کہ دیں، حالانکہ شریعت نے لڑکے کا معاملہ نواگ، لڑکی تک سے یہ پوچھنے کو لازم ٹھہرایا ہے کہ آیا وہ پیش نظر صورت میں راضی ہے۔ مگر اقل لڑکائی بھی مرد و جہاہلیت کے قص میں ہوتے ہوئے نفی میں جواب دینے کی جرات نہیں کر سکتی، لیکن اگر کرے (جس کی شاذ عملی مثالیں میرے سامنے ہیں) تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، یہاں تک کہ وہ ماں کہہ دے۔ وہ ماں باپ کی عزت کے سامنے ہتھیار ڈال کر ساری عمر کی پینا سیٹ لیتی ہے۔

اس جاہلی طرز عمل کا رد عمل نوجوانوں کی طرف سے کسی دوسری جاہلیت کی شکل میں روتا ہوتا ہے۔ ایک تو پرانا طریقہ اغوا وغیرہ کا۔ اور دوسرے نیا طریقہ خاندانی روایات سے کلینتہ بناوت کرنے کا۔ یہ دونوں خرابیاں دراصل نتیجہ ہیں پہلی برائی کا۔ یہ کبھی کبھی یہاں تک سوچنے لگتا ہوں کہ کسی قسم کے جاہلی رد عمل میں بڑا کر غلط روش اختیار کرنے کے بجائے کوئی شعور رکھنے والی خود دار لڑکی سوال کرنے والے "وکیل" سے صاف صاف کہہ دے یا نکاح خوان کو پرچہ لکھ کر بھیجے اور کہہ دے کہ یہ صورت مجھے منظور نہیں ہے اور میں شریعت کے دیئے ہوئے حق کو استعمال کر رہی ہوں۔ مغربی طرز کی آزادی نسوان کی تحریکیں چلنے والی جگہات کے مشغولوں کی سطح دوسری ہے۔ اس عام سطح کے مظالم کا مقابلہ کرنے کے لیے لڑکیوں کے اندر صحیح اسلامی حقوق حاصل کرنے کی تحریک چلنی چاہیے۔

یہ اپنی ان گزارشات کے لیے اپنی جگہ دلائل رکھنا ہوں، مگر ضروری نہیں کہ ہر بات کو دوسرے قبول ہی کریں۔ ماں میں صرف ایک اصول کے متعلق اپنے ہم فکر دوستوں سے یہ ضرور اصرار کرتا ہوں کہ وہ ہونے والے زوجین کے صحیح اور حقیقی رجحانات کو مختلف طریقوں سے معلوم کریں۔ فیصلے کو التوا میں رکھ کر بار بار اس کے متعلق اندازہ کریں کہ یہ رضا کارانہ طور پر بلکہ دلی مسرت

سے قبول کیا جائے گا یا چارہ و ناچارہ۔

دراصل والدین اور اولیا کی اپنی بے شمار مصلحتیں ہوتی ہیں کہیں بڑوں کے دیرینہ حسن تعلقات کا تقاضا سامنے ہوتا ہے، کہیں کسی زمین کا لین دین اٹکا ہوتا ہے۔ کہیں کوئی بھاری قرض لیا ہوا ہوتا ہے یا لینا ہوتا ہے، کہیں کسی عزیز کو نوکری دلوانے کی راہ نکلوانی ہوتی ہے، کہیں کاروباری مفاد سامنے ہوتا ہے، کہیں سیاسی تقاضے دباؤ ڈالتے ہیں۔ مگر یسارے معاملات بڑوں کے اپنے معاملات ہیں۔ جن کی وجہ سے اولاد کی شادی کے معاملے میں نہ دلی میلان کی پروا کی جاتی ہے، نہ اُن میں تعلیمی ہم مرتبگی کو دیکھا جاتا ہے، نہ اُن کی عمروں کے تقاضات کا کوئی احساس ہوتا ہے، اور نہ اُن کی شکل و صورت اور عادات و اطوار کے جن فرق پر نظر جاتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ بڑوں کے مصالح و مفاد اپنی جگہ، مگر وہ اولادوں کے ازدواجی مستقبل کو اُن کی قیمت میں دینے کا متی نہیں رکھتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح و ازدواج کو سادہ اور آسان بنانے کی سعی بھی کی، تعلیم بھی دی اور عملی نمونہ بھی نہ صرف خود اپنی طرف سے پیش فرمایا بلکہ اپنے صحابیوں کی زندگیوں میں اس کی پوری شان سے پیدا کی۔

بخلاف اس کے ہمارے یہاں نکاح اور شادی کو ایک بارگراں بنا دیا گیا ہے۔ لوگ اجزا کو سنت کے تحت جواز دینے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس مجموعی کارروائی کے لیے جو وسیع سنت ہیں ملتی ہے، اسے قبول نہیں کرتے اور قبول نہ کرنے والوں کے پاس ہزاروں دلائل ہیں۔ یہ بھی کہ وہ غربت کا دور تھا۔ یہ بھی کہ آج کے ماحول کے کچھ نئے تقاضے ہیں، آج شادیوں کی تقریبیں سیاسی اور سماجی تعلقات بڑھانے اور معاشرتی مرتبہ بنانے کا بھی ذریعہ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شادی آج اس معنی میں بارگراں ہے کہ صرف دولت تو اسراف کی تمام حدوں کو توڑ ہی چکا، اس کے ساتھ نمائش دولت اور مظاہرہ دولت کی ایک اور بلا چھٹ گئی ہے۔ نمائش دولت کا یہ فتنہ شادی کا رڈ سے لے کر بدی اور جہیز اور ولیمہ تک ہر جگہ رقص کرتا نظر آتا ہے۔

حالانکہ اصلاً شادی، نکاح یا ازدواج کا سارا کھیل اتنا ہی مختصراً مجلس میں گواہوں کے سامنے

ایجاب قبول ہو، خطبہ نکاح پڑھا جائے، دُعا مانگی جائے اور ان مراحل میں ضرورت کی حد تک اعلانِ نکاح ہو جائے اور بس۔

مگر آج جس طرح کا تناشا ہوتا ہے اس کے چند پہلو عرض کیے جا رہے ہیں۔

اس دور میں شادی کا پہلا شگوفہ دعوت نامے یا شادی کارڈ کی شکل میں پھولتا ہے۔ آرٹ کے نادر سے نادر نمونے، کاغذ کی اعلیٰ سے اعلیٰ اقسام، کارڈوں اور لفافوں کی مختلف اشکالیں میں کٹنگ، رنگوں کی کہ شہہ سازیوں، ہم جیسے درویش مزاج لوگوں کے دل تو کارڈ دیکھ کر ہی دہل جاتے ہیں، نہ معلوم ایسے کارڈوں سے جو کھیل کھیل جاتے گا وہ خود کیسا ہوش رُبا ہوگا۔

پھر استادِ فرنگستان کی پسند کے عین مطابق یہ کارڈ ”یگم و مسز فلان“ کی طرف سے جاری ہوگا یعنی گھر پر مہمانوں کو بلانے کے لیے صاحبِ خانہ اور قائمہ خانہ کا فریبنده ہونا کافی نہیں۔

شریف و سنجیدہ لوگوں کو سیدھی طرح یہ طے کرنا چاہیے کہ 5×5 (یا 5×5) سے بڑے سائز کا کارڈ کسی بھی صورت میں جاری نہیں کیا جائے گا۔ سیدھی طرح صاحبِ خانہ کی طرف سے دعوت دی جائے گی کارڈ سادہ قسم کے سفید کاغذ پر ہوگا اور بغیر کسی آرٹ ورک کے سیدھی سادی لکھی (سیاہ یا نیلی) تحریر میں چھپا ہوگا۔

یہ سے تبدیلی کا نقطہ آغاز!

شادی کی تقریب کو ایک بڑی کانفرنس یا سینار بنانے کے لیے ہزاروں دعوت نامے رشتہ داروں اور دوستوں، سرکاری افسروں، ادیبوں اور شاعروں، اخباری شخصیتوں کے نام نہ صرف شہر میں بلکہ ملک بھر کے مختلف گوشوں میں پہنچائیے جائیں گے۔ حالانکہ لڑکے والے ہوں یا لڑکی والے، اتنا کافی ہے کہ چند قریبی رشتہ داروں کو بلایا جائے۔ چند اہم ہم پیار و ہم نوالہ دوستوں کو مدعو کر لیا جائے۔ اور بقیہ حلقہٴ تعارف کو اگر خطہ ط جائیں تو اس معنون کے ہوں کہ آپ اس تقریب کے لیے وقت، پیسے، جسمانی تکلیف اور کام کے ہرج میں نہ پڑیں، صرف تقریب کا کامیابی اور زینت کے حسن تعلق کے لیے دعا فرمائیں۔

اب اگر ہر صحافی، ہر عالم، ہر ادیب، ہر سیاسی لیڈر، ہر سرکاری افسر اور ہر تحریک اسلامی کا ہر نمایاں فرد یہ چاہے کہ وہ بچے یا بچی کی شادی کی تقریب کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہم رنگ لوگوں کو جمع کر کے خاص طرح کے اثرات پیدا کرے گا تو اس طرح تو اصلاحِ احوال ممکن نہیں۔ قصبوں اور بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ ہزاروں کا مجمع جمع کر لیتے ہیں۔ اور ان کی تقلید میں شہر کے متوسط الحال اور محنت کش بھی امکانی حد تک ایک ہجوم کا انتظام کرتے ہیں، پھر اس سے آگے دیہات کے جاگیردار اور وڈیرے تو الگ رہے، معمولی حالات کے لوگ بھی ایک انبوہ ہم کر لیتے ہیں۔

حالانکہ ایسی تقاریب بسا اوقات تو بارگراں میں بن جاتی ہیں۔ مثلاً پچھلے دو ماہ میں صرف اپنے شہر سے ہی مجھے ہر پختہ کبھی ایک اور کبھی دو دعوت نامے موصول ہوئے۔ اب ان میں جا کر کوئی کس سے کیا سیاسی یا ادبی یا صحافی اثر لیتا ہے۔ ہر کسی کو جلدی پڑی ہوتی ہے، نکاح میں شمولیت کی یا ولیمہ کھایا اور رخصت۔ اللہ اشرف علما۔

مجھے اصرار ہے کہ بنیادی طور پر ان تقریبوں کو گھریلو اور خاندانی حد تک محدود رہنا چاہیے! دو چار افراد کو ہم مقصدی یا کسی خاص تعلق کی بنیاد پر بلایا جاسکتا ہے۔ مگر کوشش یہ کرنی چاہیے کہ لڑکی اور لڑکے والے دونوں گھروں میں ۵۰، ۵۰ سے زیادہ مہمان (مع خواتین) نہ ہوں۔ زیادہ بڑی قربی برادری والوں کو کسی قدر ڈھیل مل سکتی ہے، مگر ایسی نہیں کہ وہ میلہ ہی لگا دیں۔

شادیوں کا ایک بڑا فتنہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سسرال والے کیا دیں گے یا لڑکوں کی طرف سے بڑی کیسی آٹے گی۔ اور ہر کتنا ہو گا۔ اور لڑکی والے جہیز بھی کیا کچھ دیں گے۔ بلکہ شادیاں طے ہونے میں یہ سوال بہت دخل رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سچے مسلمانوں کے سوچنے کا یہ انداز ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ کجا یہ حال کہ آج کل ایک دوسرے سے مطالبے کیے جاتے ہیں، خصوصاً لڑکی والوں کو تو مجبور کیا جاتا ہے کہ اتنے تولے سونا اور فرج اور ٹیلی وژن ضرور دینا ہوگا۔

اس ذہنیت کو یکسر ختم ہونا چاہیے۔ اگر دونوں طرف سہ ماہی، اسلامیت ہے اور دولتِ شرافت

جسے تو پھر کسی فریق کو دوسرے کے متعلق نہ خاص امیدیں رکھنی چاہئیں، نہ مطالبے کرنے چاہئیں، اور نہ ساری عمر لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے کو، اور نہ لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی اور اس کے والدین کو یہ طے طے چاہئیں کہ تم لوگوں نے تو حق ادا کیا ہی نہیں، وغیرہ۔

اس معاملے میں دونوں طرف غیرت و حمیت اور بے نیازی و خرد داری ہونی چاہیے۔ جو کچھ لڑکے والوں کی طرف سے از خود ہو سکے وہ قبول، اور اس طرح لڑکی والوں طرف سے رضا کارانہ اور مخلصانہ جذبے سے جو کچھ ہو سکے وہ منظور۔

بلکہ دونوں فریق ابتدا ہی میں ملی کر یہ بات ہمدردانہ جذبات سے طے کر لیں کہ بھائی نہ اپنے اوپر بے جا بوجھ ڈالنا اور نہ قرض لینا اور نہ ہر لئے نمائش کوئی کام کرنا۔ اور یہی مشورہ دوسری طرف سے ہو۔ جو کچھ جس کے بس میں ہو وہ وہی کچھ کرے۔ جیسا کھانا دے سکتا ہے، دے۔ اور جیسا سامان وہ فراہم کر سکتا ہے، کرے۔ دونوں طرف صاف دلی سے اپنے اپنے گھروں کے تمام لوگوں کو اس پر پہلے سے مطمئن کر لیں کہ ہمارا اصل مقصد رشتہ و ربط ہے، کسی ذہنی منافد کو کمانا مطلوب نہیں ہے۔

کتنی ہی ہماری بہنیں اور بیٹیاں شریف دینی گھرانوں میں باوجود تعلیم اور شکل و صورت اور خانہ داری کی مہارت کے کنواری بیٹی بیٹی بڑھی ہو جاتی ہیں، مگر ان کو معاشرہ اس امر کی سزا دیتا ہے کہ گتھارے والدین اور تم اتنی مقدار میں جہیز فراہم نہیں کر سکتے۔

میں پوچھتا ہوں کہ ہم میں کتنی مثالیں ایسی ہیں کہ اس طرح کی دردناک صورتوں میں کسی مظلوم بچی یا خاتون کی دستگیری باوجود خوش حالی کے، اور باوجود دولت مند گھرانوں سے رشتے طے کرنے کی گئی ہو۔

اس طرح دوسری جانب یہ عبرت انگیز نقشہ بھی موجود ہے کہ کسی غریب مگر نیک نہاد اور قابل نوجوان کو کوئی گھر اس لیے قبول نہیں کرتا کہ وہ کوئی بڑا مہر نہیں دے سکتا یا شاندار بڑی نہیں سے سکتا۔ یا الگ رہنے کے لیے اپنا مکان نہیں بنا سکتا۔

یقیناً یہ کہ لوگ اسلامیت اور شرافت اور پردہ داری کے بالمقابل بالکل تارکِ دین اور غلامانِ مغربیت و اشتراکیت تک سے قاورہ جا ملاتے ہیں۔

کوئی اپنے بلند معیارات سے نیچے اترنے پر تیار نہیں ہے، کوئی اپنی مالی سطح سے نیچے نگاہ بھی نہیں ڈال سکتا۔ اور کوئی اپنے گھرانے سے باہر جھانکنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اور اسلام دور کھڑا یہ سارا نامناشا دیکھتا رہتا ہے۔ قیمتی ہیں وہ چند افراد جنہوں نے ان سلاسل و اغلال کو توڑ کر اسلامیت کے علم کو بلند کیا ہے! فکثوا اللہ امتا لہم۔

میری نگاہ سے کفو کا مسئلہ اوجھل نہیں ہے۔ اس کی بھی ایک اہمیت ہے۔ مگر کفو کے مفہوم کو متعین کرنے میں فرق ہو سکتا ہے۔

کفو کے مسئلے کا صحیح مفہوم ان مناکحتوں کے تفصیلی مطالعہ سے اخذ کیا جاسکتا ہے جو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیں، اور پھر جن کا انعقاد صحابہ کرام کے مختلف قبیلوں کے درمیان کرایا۔ ایک کلمہ و مقصد کے مہاجرین و انصار کے درمیان کفو کا وہ تصور وسیع ہو گیا جو دورِ جاہلیت میں انتہائی محدود تھا۔

بعد کے احوال و واقعات نے تبدیلیاں پیدا کیں۔ جب پیشے نسلاً در نسل چلنے لگے تو آسانی اسی میں سمجھی گئی کہ کاشتکاروں کی اولاد، نور بافوں کی اولاد، کفشدوزوں یا گلگروں کی اولاد اور اسی طرح عاملوں یا مولویوں کی اولاد اگر اپنے ہی جیسے گھروں سے مربوط ہو تو ذوق و عادات کی ہم آہنگی اور گھروں میں بونی جانے والی اصطلاحات اور مخصوص قسم کے رواجوں اور روایات کا فہم سہل تر ہو گا۔

اوپر سے ستم یہ ہوا کہ ہمارا پالا ہندو سوسائٹی سے پڑا جو چار حصوں میں تقسیم تھی اور ہر حصے کے فرائض جدا جدا تھے۔ لہذا ہر حصے کے لوگ اپنے ہی سلسلے کی برادریوں میں جگہ پاسکتے تھے۔ اس حالت کو پہنچ کر ہمارے دن کفو کا تصور اور بھی بوجھل پیچڑن گیا۔

لیکن آج جب کہ مختلف پیشوں اور مشاغل کا تسلسلہ درجہ بدرجہ ہو چکا ہے، تعلیم اور عہدوں نے پرانے خاندانوں سے اٹھنے والی اولادوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کفو کے مسئلے پر نظر ثانی کی جائے۔ کفو کی اصل حقیقت یہ ہے کہ دو گھروں کے درمیان جب ہم ہوں تو ان کی تعلیم، ان کا ذوق، ان کا مقصد، ان کی عادات اور ان کے طور طریقے یکساںت پیدا کرنے

میں منہ ہونے چاہئیں۔ نیز دونوں طرف کے خاندانوں میں بھی معاشرت کی کوئی خلیج حاصل نہیں رہتی چاہیے۔
 میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی مقاصد کے لیے کام کرنے والے تعلیم یافتہ، شریف اور باعزت
 زوجین دوسری کسی صورت کے مقابلے میں ہزار گونہ زیادہ اسباب ایسے رکھتے ہیں جن پر کفو کا
 اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

ایسے ہم عقیدہ و ہم مسلک لوگوں کو تو آغاز کار اس اور ایک حقیقت سے کرنا چاہیے کہ حکم
 من آدم و آدم من تواب۔

اب میں بارات کی تیاری کے مسئلے کو لیتا ہوں۔

رواج ہو گیا ہے کہ بڑی بارات لے کے جایا جائے اور رعب بٹھایا جائے کہ ہمارا دائرہ اثر بڑا
 وسیع ہے۔ دائرہ اثر ہر ایک کا اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ سو ڈیڑھ سو یا دو سو آدمی اکٹھے کر لے
 جائے، اور باراتوں میں بہت سے آدمی اکٹھے کر لینے کے معنی یہ بھی نہیں ہوتے کہ کسی طرف حقیقی رتبہ
 بلند یا سماجی مرکزیت موجود ہے۔ ہو بھی تو اس کی نشاں کی کیا ضرورت۔ آپ دوسروں (جو حقیقت
 اپنے ہی ہیں) کے سر زیادہ بوجھ ڈال کر فخر کیوں محسوس کریں۔

پھر ایک نشا دو بہا کے ہار سنگھار کا ہوتا ہے۔ پہلے طلے والے کئی ہار مچھراؤ پر نوٹوں کے ڈالے
 کہیں ایک ایک روپے والے نوٹوں کے ڈالنے نائے خریدے جاتے ہیں، کہیں دس دس روپے والے
 اور کہیں سو سو روپے کے نوٹوں کے۔

یہ تو گر یا صریح طور پر اظہار ہے وافر دولت کا، یعنی دولت اچھلی رہی ہے، اہلی پرہتی ہے،
 بالعموم اس قسم کے ہار کم پڑھے کلمے، کا دو باری لوگوں میں رائج ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی گلے کے اوپر
 جعدار تک بیڑا مارا کرتے ہیں اور یا پھر مشرق وسطیٰ سے کماٹی کر کے لانے والے محنت کشوں کے
 گلے میں دولت کے یہ بندھن زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

مجھے اگر دو بہا کو عام بارات سے ذرا سنا یاں ہی رکھنا ہے تو گلاب کے مچھو لوں کا ایک ہار

لے اس مقصد کے لیے بڑی مقدار میں یہ نوٹ کھلی بلیک مارکیٹ میں سکتے ہیں۔

اس کے گلے میں ڈال دو، اور بقیہ بارہ تینوں کو موتیے کا ایک ایک ہار دے دو۔ ضرورت کے لیے نرائنا کاٹی ہے۔ اگر چہ میں نے حال ہی میں ایک ایسی مثالی شادی کی مثال اور مختصر بارات بھی دیکھی ہے کہ دو لہا تک ہر قسم کی خصوصی آرائش سے بے نیاز منشا۔ واہ وا!

پھر دو لہا کی کار سمجھتی ہے۔ اس کے لیے ہلٹے کی بھی اور پھولوں کی بھی ایسی جالبان بکتی ہیں جو کاروں کو ”پہنا“ دی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر کار کو ضرور نمایاں ہی کرنا ہو تو اس کے سامنے کے شیشے کے اوپر کی جانب پھولوں کا ایک ہار، یا گوٹے یا گلے کی ایک سادہ سی لڑی کافی ہے۔ اسے محض ایک علامت کی حد تک رہنا چاہیے۔

مجلس نکاح کا انعقاد بالعموم محلے کی قریبی مسجد میں ہو تو افضل ہے، ورنہ کسی اور قریبی کشتہ جگہ پر نشست کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ مجلس نکاح کے عام شرکاء کی تواضع زیادہ سے زیادہ کسی ٹھنڈے مشروب یا چائے کی پیالی سے کر دینا کافی ہے۔ کھانے کا انتظام صرف بارات کے لیے ہو اور بالکل حد استطاعت میں۔ لیکن کھانے پینے کے تمام انتظامات خواہ لڑکی والوں کے ہاں ہوں یا لڑکے والوں کے ہاں (خاص طور پر ویدیم، بیکریز، بوفے، سسٹم پر نہ کیے جائیں۔ یہ اسی تہذیب اعتبار کی ایجاد ہے جس کے خلاف ہماری معمولی لڑائی ہے۔ اس کے طور طریقوں کی تعقید سے انتہائی طور پر اجتناب کرنا چاہیے۔ جو لوگ کرسیوں کا انتظام نہ کر سکیں وہ دریاں بچھالیں، جہاں ایک ہی مرتبہ سارے حاضرین کی تواضع ممکن نہ ہو (حالانکہ ۵۰، ۵۰ کی تعداد ایسی نہیں) تو دو نشستیں کر لی جائیں جیسے کہ ہمارے ہاں قدیم دستور رہا ہے۔ ان لوگوں کے تو ذہن ناقابل فہم ہیں جو ہزاروں روپے دوسرے امور پر خرچ کرنے کے بعد صرف کرسیوں یا دروں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے (لاٹے بچارے مفلسین تو تم!)

لڑکے والے گھر میں زور شور سے اور لڑکی والے گھر میں کسی قدر کم پیلنے پر روشنیوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لوگ حد کر دیتے ہیں۔ ۵۰، ۵۰ ٹیوٹ لائٹیں لگی ہیں۔ عمارت کی دیواروں اور درختوں اور جھاڑیوں کو چھوٹے چھوٹے رنگدار بلبوں کی کثیر تعداد سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ بسا اوقات روشنیوں کی لمبی قطار ڈور سڑک تک جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ جھنڈیاں لہراتی ہیں۔

میں نے خود دیکھا کہ ایک کوٹھی پر تین چار دن تک رنگ برنگی روشنیوں کو اس طرح آراستہ کیا گیا تھا کہ شاید یہی کوئی انج جگہ خالی ہو۔ ایسے مناظر کیا روٹی اور دوا سے محروم غریبوں کا خون نہ کھولا دیتے ہوں گے۔ بجلی کی کسی کا ماتم تو الگ رہا۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کام کرنے یا مہمانوں کو ٹھیرانے یا کھانا کھلانے کی جگہ اعتدال سے روشنی کا انتظام کیا جائے۔

ہم لوگ جس دولت کو اس طرح اڑا دیتے ہیں کیا یہ دوسروں کی حق مارنا نہیں ہے اور کیا ہمیں پیسے کا حساب آخرت میں نہیں دینا ہوگا۔ کیا دنیا اندھیر نگری اور دولت ایک خزانہ یعنی ہے کہ جس کا حیننا جی چاہے لوٹ لے اور پھر اس کو چاہے تو دریا بڑھ کر دے، چاہے تو آگ لگا دے۔ جی نہیں! یہ خدا کے خزانے کا مال ہے اور اس کے ہر ذرے کا حساب دینا ہوگا۔

پھر کہیں باراتوں کے ساتھ مینڈ باجے اور گولے پٹاخے ہیں اور کہیں لڑکے والوں کی طرف ساعت شکن وامیہات ریکارڈنگ کا طوفانی شور ہے اور لڑکی والوں کی طرف ”گھرے تھالی“ اور ڈھولک کے پاکیزہ گھر بلوگیتوں سے معاملہ آگے بڑھ کر ”اپنا“ والی ثقافت تک جا پہنچا ہے کچھ فلمی بول بھی ہیں، کچھ دھمال لڑی بھی ہے، فن کی ماہرات بھی جاشعل ہوتی ہیں بلکہ بلوائی جاتی ہیں۔

گویا شادی نہ ہوئی کوئی سلطنت فتح ہو رہی ہے اور اس کا جشن منایا جا رہا ہے۔ اسلام میں تو ایسا جشن بھی سجدہ عبودیت سے منایا جاتا ہے۔

یہ مسلمان جن کے آدھے بھائی افغانستان اور فلسطین، لبنان اور شام، بھارت اور حبشہ، فلپائن اور افریقی ریاستوں میں ہزار در ہزار ذبح ہو رہے ہیں اور آدھے بھائی مہاجر بن کر دنیا کے متعدد کیمپوں میں پڑے ہیں، اور جن کے ایک طرف روس اور دوسری طرف بھارت جدید اسلحہ سے لیس کھڑے ہیں۔ ان کی دلچسپیوں اور مشاغل کا یہ حال ہے۔

ان ساری لغزبات کو چھوڑے بغیر اہر و احد کی عبادت اور اس کے دین کی سر بلندی کا کام

نہیں کیا جاسکتا۔

شادیوں میں لڑکے اور لڑکی والوں کے گھروں میں چاہے کچھ پردہ بھی ہو، مہمان خواتین کی وجہ سے بے پردگی کی پیاد آتی ہے کہ لباسوں کی رنگینی اور زیورات کی چمک دمک اور میک آپ کی قبر مانی کا طوفان دین و اخلاق کی ساری قدروں کو پہالے جاتا ہے۔ میں نے ایسے جو منظر دیکھے ہیں ان کی وجہ سے تقاریب نکاح کی کراہت دل میں بیٹھ گئی ہے۔

شریف دیندار لوگوں کو نہایت جوأت کے ساتھ دعوتی کارڈ کی پشت پر ضروری گذارشات میں یہ بھی لکھ دینا چاہیے کہ جو خواتین شریک ہوں، براہ کرم لباس اور زینتوں اور میک آپ کو چھپانے والے مکمل پردے کے ساتھ شریک ہوں اور مردوں میں گھسنے اور دروازے سے بار بار جھانکنے سے پرہیز کریں۔ یہ بات محذوف ہی رہنے دی جائے کہ جن سے یہ پابندیاں نہ اٹھائی جاسکتی ہوں وہ معاف ہی رکھیں۔ اور اپنے تعلقاٹ کے تقاضے کسی دوسرے وقت پردے کر لیں۔ کیونکہ کسی گھر میں ایسی خواتین کی چلت پھرت مہانوں اور محلے داروں پر بھی یہی اثر چھوٹے گی کہ یہ تارکین پردہ کا گھر ہے۔

جس ملک میں پردے کے خلاف امر کجہ اور اسرائیل اور روس کی تہذیب نے یہ جنگ چھیڑ رکھی ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلقین کردہ نظام پردہ کو ختم کرنا ہے، وہاں دوسروں کے لیے اس طرح کی غلط فہمی کا ناستہ کھولنا بھی خطرناک ہے۔

یہاں ایک افسوس ناک حقیقت کا ذکر ضروری ہے کہ بہت سی صورتوں میں دوہا کی جانب سے شادی کے وقت یا کچھ دیر بعد لڑکیوں سے پردہ ترک کرنے کی شرط منوائی جاتی ہے اور اس شرط کے سامنے ایسے والدین اور ان کی بیٹیاں تک سر جھکا دیتی ہیں جنہیں اسلامیت اور پردہ داری کے لحاظ سے معروف مقام حاصل ہوتا ہے۔ پردہ کے خلاف ابلسی جنگ کے ایسے ایجنٹوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنی چاہیے۔

بیچ میں ہندی اور تیل وغیرہ کی رسموں اور ان کی مقررہ شریعت کا معاملہ رہا جانا ہے۔ یہ سب

فضول باتیں ہیں، ہندو تہذیب کے اثرات ہیں، ان کو چھوڑ کر بغیر کسی تقریب کے مہندی کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ خود لڑکی والے اپنی طرف سے بھی کر سکتے ہیں اور لڑکے والوں کو بھی سنبھلی چڑ تو وہ بھی ایسے چوڑے چکروں کے بغیر بھیج سکتے ہیں۔ تیل وغیرہ کو چھوڑ بیٹے، لایعنہات کا سلسلہ لمبانا نہ کیا جائے۔

اب بیجیے، مہر کی بات !

لڑکی والوں کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی رقم کا مہر باندھیں اور وہ لڑکے کی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر ہی ہوتا ہے۔ دس ہزار، پچاس ہزار، ایک لاکھ، عزمین کہ جس معاشی مرتبے کا لڑکا ہو اس کے مطابق مقدار مقرر کی جاتی ہے، بلکہ ضد کی جاتی ہے، جھگڑے کیے جاتے ہیں، کبھی تو اس پر رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ دراصل لڑکی والے سمجھتے ہیں کہ یہ ایک رستہ ہے جو وہ ہونے والے داماد کے گلے میں ڈال کر اسے اپنے قابو میں رکھ سکتے ہیں اور اس رستی کا سرا لڑکی کو بھی تھما سکتے ہیں۔ حالانکہ بھاری مہروں نے نہ کبھی ٹوٹے نکاحوں کو بچایا ہے اور نہ پھینے پھولنے والے نکاحوں کو کم مہروں نے ناکام کیا ہے۔ مہر ہی نہیں، خرچے لکھوانے اور بعض شرائط منوانے تک بات جاتی ہے۔

دوسری طرف لڑکے والے ہیں جو اس سودا بازی میں کم سے کم قیمت پر قربات کو لانے کی کوشش کرتے ہی ہیں۔ اکثر اوقات ایک آواز شرعی مہر کی بھی سننے میں آتی ہے اور تاسی کی مختلف مقداریں اہل تادیل نے متعین کی ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جہاں کھلے دل سے اپنا اعزاز سمجھ کر لڑکے والے اغنیاء نے بڑے بڑے مہر خوشی خوشی مقرر کیے ہیں، داں ایک طرف خود حضور کی طرف سے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیا ہوا سادہ سا جہیز ایک دلکش نمونہ ہے۔ دوسری طرف صحابہ کرام کی شادیوں کے مہر ایسے بھی مقرر ہوئے کہ شوہر اپنی بیوی کو علم سکھائے گا، یا پیغام دینے والا امیدوار اسلام لے آئے گا اور اسلام لانا ہی اس کا مہر ہوگا۔

بدیں وجہ مہر کے متعلق کوئی ایسا قطعی منصوص اور صحابہ ہی معمول بہ مہر نہ تھا جسے اب صدر صاحب کی طرح "شرعی جہوریت" کی مانند شرعی مہر قرار دیا جاسکے۔

ہر ایک تو رستہ کشی سے مقرر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ شخص متعلق کی حیثیت کے مطابق اس کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اگر زیادہ ہر مقرر کرے تو اسے اپنا اعزاز سمجھے کہ مقرر کرے جو عموماً اس سے حسن سلوک کا بہترین معیار قائم کرنے والے مرد بھی بہترین کردار کے ہوتے ہیں۔

دوسرے ہر صرف شادی کے وقت کی مالی حالت کی بنیاد پر ہی مقرر نہیں کیا جاتا، بلکہ مستقبل قریب کے معاشی امکانات کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے اور ایک مرد کی نگاہ کو دور تک جانا چاہیے۔ آخر اولاد کاموں کے لیے وہ مستقبل کی امید پر قرض لیتا ہے تو نکاح ہی کے لیے مستقبل کی امید پر مرغیر معجل کی مقدار کیوں زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ مکان بنانے اور گاڑی خریدنے کے لیے تو سود پر بھی قسطوں والے نظام فروخت میں ذمہ داری اٹھالی جاتی ہے، آخر بیوی ہی کو اقساط میں کیوں ادائیگی نہیں کی جاسکتی۔

لڑکی والوں کی بھی اسلامیت اور شرافت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ہر کو مرد کے لیے ایک لگام اولاد رستے کی نیت سے استعمال کرنے کا ذہن ہرگز بیچ میں نہ آنے دیں۔ کسی مرد کا دیندار، شریف اور شائستہ اطوار ہونا ہی اس کا سب سے بڑا اہر ہے۔ اسی طرح بگڑی کے معاملے میں بھی سارا معاملہ مرد یا اس کے خاندان پر چھوڑ دینا چاہیے۔

ہر کی بات آئی تو یہی معاملہ جہیز کا بھی ہے۔ کسی شخص یا خاندان کا یہ سوچنا کہ ایک لڑکی (یا اس کے والدین) اس کا گھر بھرے اور شادی ایک معاشی مسئلہ اور کمائی کا ذریعہ بنے، مرد کے لیے تو ڈوب مرنے کی بات ہے۔ اگرچہ اخلاقی انحطاط کے موجودہ دور میں چلو بھرنی پانی میں ڈوبنے والے نہیں رہے۔ بلکہ تالابوں اور سمندروں کے پانی میں تیراکی کرنے والے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، مگر چھٹی مردانگی کا ایک عزم و وقار ہے۔ اس کا مقام غیرت و خودداری ہے۔ وہ (یا اس کے گھر والے) انتہی گری ہوئی بات کہنے پر آمادہ ہی کیوں ہوں کہ آنے والی لڑکی کے لیے لازم ہے کہ وہ دولت کا ایک طوفان اور سامانوں کا ایک انبار لے کے آئے۔ مردوں میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ ہم کپڑے اور زیور سے لے کر فرنیچر اور برتنوں تک اور سامان آسائش سے لے کر سامان آرائش تک سب کچھ حسبِ منشا خود فراہم کر بیٹھے، مگر فریقِ ثانی کے سامنے یہ سوال یا مطالبہ رکھنا کہ

ہیں یہ کچھ اور اتنا اتنا دیا جائے۔ ایک طرح کی گداگری ہے۔

یہ آگ بات ہے کہ تمام والدین اپنی لاڈلی بچیوں کے لیے کچھ نہ کچھ سرو سامان کرتے ہیں اور کرنا چاہیے۔ لیکن حالاتِ زمانہ سے مجبور ہو کر اتنا خرچ کرتے ہیں کہ بسا اوقات قرض اٹھا کر بعد میں بڑھاپے کی زندگی نہایت مشکلوں سے گزارتے ہیں۔

لڑکے والوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ اپنا ہی ایک دوسرا گھر مصائب سے دوچار ہو، یا قرض کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو۔ یہ حالت تو رحم کھانے کی ہے۔

جہیز کے معاملے میں (بڑی کی طرح) ایک مصیبت یہ ہے کہ اس کی نمائش بے حد ضروری ہے مان بڑے فخر و ناز سے دکھاتی ہے کہ اس نے کیا کب زبور بخواتے ہیں، کتنا سونا خریدا ہے، کپڑوں کو چھیلا کر دکھاتی ہے کہ ان میں بیشتر جوڑے "باہر کے" ہیں، ورنہ اگر پاکستانی کپڑے کے ہوں تو ناک نہ کٹ جائے اور سسرال والے بگڑ نہ جائیں۔ پھر برتن، صوفہ سیٹ، دو دو پلنگ، چار چار بستے، اس سے آگے بڑھ کر فرج اور ٹیلی وژن، ورنہ کم سے کم ریڈیو سیٹ، پریشر کک، برقی استری، واٹر کولر، ڈنر سیٹ، واٹر سیٹ، چائے کے سیٹ کافی کے سیٹ، فروٹ پیش کرنے کے سیٹ، ڈرائی فروٹ رکھنے کا سامان، دو لہا دلہن کے لیے گھڑیاں۔ پھر سنہری کام کے جوڑے، کشیدہ کاریاں، سردی کے خاص لباس۔ غرضیکہ ایک صحن میں لپورا انا رکھی سا جاتا ہے۔

اوپنچے گھرنے کی ریس کرنے والی یہ امیں پچھلے کئی کئی سال اپنی اور بچوں کی غذائی اور دوائی ضروریات میں کمی کرتی ہیں، پھر قرض چڑھا کر اُسے اتارنے کے لیے طرح طرح کی مشقتیں کرتی ہیں جتنی کہ ان کی پوری زندگیوں کا پین دو ایک لڑکیوں کے جہیز کی چکی میں پس جاتا ہے۔ مگر خود پرست انسانوں کو ان پر رحم نہیں آتا۔ کیونکہ ان کے مقابلے پر کوئی دوسری ماہیں زیادہ مال و متاع لیے موجود ہوتی ہیں۔ یہ فری کبھی ٹیشن کی مارکیٹ ہے۔ اس میں اخلاف کا سکہ نہیں چلتا بلکہ مال کی قدر مانی جاتی ہے۔

جہیز کے متعلق کسی حالت میں دوسرے فریق کو مطالبہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ قرض یا معاشرتی مصیبت جھگڑنے سے دوکنا چاہیے۔ جہیز جو کچھ بھی بنے، حالات کے مطابق سہولت سے بنے خوشی سے لیا

جانے، دکھاوا نہ کیا جائے (نہ اس گھر میں نہ اس گھر میں)، اور کبھی ساری عمر جہیز کی کمی کا ماتم نہ کیا جائے۔ اور لڑکی یا اس کے والدین کو طعنے نہ دیے جائیں۔

یاد رکھیے کہ کسی مجبوری بھالی پردہ پشت دینا لڑکی کی عصمت و عفت اور اس کی نگاہوں کی پاکیزگی اور دنیا کی لذتوں اور کھیل تماشوں سے بے نیازی ایک ایسی گمان بہا متاع ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا جہیز ان چیزوں کی کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔

پاک و امن لڑکیوں کا مرتبہ اتنا بلند ہے جو لوگ شوخ و شنگ محفل گرد حسیناؤں کے ڈسے ہوتے ہوتے ہیں وہ ساری عمر نسوانی پاکیزگی کو ترستے رہتے ہیں۔

شادی بیاہ کے سلسلے میں دلیر بھی ایک بڑا غور طلب اور اصلاح طلب موضوع ہے۔ دلیر کا کارڈ بھی اگر الگ سے جاری ہو تو وہ بھی (پہلے ذکر کردہ دعوت نامے کی طرح) سادہ ہونا چاہیے۔ دلیر میں کئی کئی کھانوں اور پھلوں کا انتظام کر کے شانِ امارت دکھانے کی ضرورت نہیں۔ متوسط طریقے سے سیدھے سادے دو ایک کھانے ہونے چاہئیں۔ دلیریوں میں زیادہ تعداد دونوں طرف کے رشتہ داروں کی ہو، ٹھوڑے بہت احباب بھی شامل ہوں، مگر ہدایت نبوی کے مطابق ایک تعداد غریب طبقے کے پڑوسیوں کی بھی ہو۔ انہیں بھی عزت و آبرو سے بٹھا کر مناسب انداز سے کھانا کھلایا جائے بلکہ اگر خوش حال لوگوں کے سامنے ہی انتظام ہو تو ان میں طبقاتی تفاوت کے احساسات کو نشوونما نہیں ملے گی۔

آج کل تو ایسے ایسے دلیریوں کا انتظام ہوتا ہے جیسے دور عباسی میں ملکہ خیزران کی شادی کا اہتمام ہو رہا ہو۔

خدا کے بندو! بندگی و مسکینی کی سلج پہ اپنے آپ کو لاؤ۔ اور شادی کے ہر مرحلے کو نمائشِ دولت کا ذریعہ نہ بناؤ۔

جسے خدا نے ضروریات سے زائد دولت دی ہے وہ اس میں شادی بیاہ کے موقع پر زیادہ سے زیادہ حصہ غلبہٴ اسلام، تبلیغِ دین، تعلیمِ قرآن، یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کی بہبود اور رفیقانِ دق و حیزام کے علاج کے لیے صرف کر کے ایک مثال قائم کرے۔ اور نہیں تو کم سے کم اتنا تو ہو کہ شادی

کے فریقین اپنے اپنے خرچ کا پانچواں یا دسواں حصہ انفاق فی سبیل اللہ کے لیے متعین کر دیں۔

آخری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ مخالف اور سلامیوں کا سلسلہ بھی اب جلد محدود کو مچھلا نکلنا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انڈرون خانہ کے محدود حلقہ اعزہ کے سوا سب کو اس طرح کی تکلیف سے روک دیا جائے۔ ایک نو لوگ شوکت کے لیے وقت اور مصروفیات کی قربانی دیں، اُدپر سے مخالف کا انتظام بھی کریں اور اس میں بھی اظہارِ قربات و خلوص کا مقابلہ کہ کیا چیز دوسروں سے بلکہ کے نادر محسوس ہو۔

اس طرح سلامیوں کا سلسلہ اب پچاس اور سو روپے کی حدوں سے بھی تنجاؤ کر کے پانچ پانچ سو روپے تک پہنچ گیا ہے۔ بعض مثالیں ایسی بھی میرے علم میں آئیں کہ لاکھ روپیہ تک سلامی میں ایک پارٹی رکھتی ہے۔

سلامیاں وغیرہ بھی قریبی گھر ملیہ رشتہ داروں میں اعتدال سے چلیں اور اگر کسی کو دس پانچ سو روپے کی توفیق ہو تو اس کی طرف سے اسی کو علامتِ خلوص سمجھا جائے۔

شادی ہو چکنے کے بعد ازدواجی زندگی کی خوبصورت اُٹھان ہی وہ اصل پیر ہے جس پر توجہ دی جانی چاہیے۔ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کو جادہٴ حیات کی ہم سفر اور رفیقِ منزل سمجھے، نہ یہ کہ ایک خادمہ یا لونڈی حاصل ہو گئی ہے۔ جس کی نسائی فطرت کی وجہ سے اسے ہر وقت غیظ و غضب، طعن و طنز اور بد اعتمادی اور سوتے ظن کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ عورتیں مردوں کے پاس خدا کی طرف سے ایک امانت ہیں۔ ان کے ساتھ بلاوجہ بدسلوکی اور بدگوئی کا رویہ کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔ یہ ذمہ داری بھی مرد ہی کی ہے کہ وہ اپنی ماں بہنوں کے احترام اور بیوی کی محبت کے حدود قائم رکھے اور کسی ایک طرف جھکا کر انتہا پسندی اختیار نہ کر لے جو بیوی کے حقوق اور معاملات ہیں ان میں حصہ کے دوسرے لوگوں کا کوئی دخل نہیں، جو ماں بہنوں کے حقوق ہیں ان میں بیوی کا حصہ نہیں بن سکتی۔ اب یہ مرد کا اپنا کام ہے کہ الگ رہن سہن اگر میسر نہ ہو تو عدل کی تلوار کی دھار پہ اس توازن سے چلے کہ معاملے کو کسی طرف سے بگڑنے نہ دے۔ جہاں کہیں بیویوں و شوہروں کی طرف سے محبت اور

اعتماد اور مستحفظ حاصل رہتا ہے۔ وہاں ملے جلے گھروں میں کچھ زیادہ خرابی نہیں ہوتی۔ بصورتِ دیگر گھر پر سالوں سے چھپائی ہوئی دو تین عورتیں جب ایک نئی عورت کو اس دائرے میں داخل ہوتا دیکھتی ہیں تو بالعموم اس کا جینا دو بھیر کر دیتی ہیں، سبب کہ شوہر صاحب ایک طرفہ سماعت رکھتے ہوں۔ ایسے گھوگھوٹا ٹپ شوہر ساری ساری نندگیاں اپنے گھر کو امن و سکون سے محروم کر کے گنڈا کر دیتے ہیں۔ نہ خود آرام سے رہتے ہیں، نہ بیوی کے لیے چین اور نہ بچوں کے لیے سکون۔ محض دل کے یک طرفے سے پیدا شدہ ایک مبہم احساس کے مہیب سایوں کو اپنے اوپر اور گھر کے اوپر مسلط رکھتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو یہ حکمت معلوم نہیں کہ شوہر ایک مدت میں بیوی کو گھر سے تیار کر کے تارکے اور بیوی کچھ عرصے میں اپنا شوہر تراشتی ہے۔ بعض رویتے دوسرے فریق کے لیے چھوٹے پڑتے ہیں اور بعض انداز اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہ کام گھر پر مارشل لا سے نہیں محبت و اعتماد سے انجام پاتا ہے۔ یوں تو اب مشرک خاندانی نظام آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے، مگر جہاں باقی ہے وہاں لوگوں کو چاہیے کہ اپنی پرانی روش کو بدلیں اور نئی آنے والی خاتون کو کھلے دل سے خوش آمدید کہیں اور اُسے اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون دیں اور اس میں اعتماد پیدا کریں ورنہ اگر ہر وقت ٹیڑھی باتیں کی جانے لگیں تو اس قدر کی حساس لڑکیوں کو اُس طرح اندھے صبر کے کوہوں میں پھینکا جا سکتا۔ جیسے پہلے ہوتا تھا۔ نہ اب زمانہ وہ رہا ہے کہ شادی سے پہلے جن دو گھروں میں محبت تھی، شادی کے فوراً بعد ان دونوں میں محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔

شادی کی تجویز کرنے سے پہلے گھر کے نئے نقشے کے متعلق ہونے والے شوہر صاحب بھی اور ان کے والدین اور بھائی بہنیں بھی اچھی طرح سوچ لیں۔
یہ سے اصلاحات کا خاکہ جو میرے ذہن میں ہے۔

جیسا کہ اوپر میں نے کہیں لکھا ہے کہ بعض خدا پرست اور سخیک اسلامی کے فدائی اور کارکن زندگی کے معاملات میں غلط طریقے اختیار کرتے ہوئے یہ غلط پیش کرتے ہیں کہ بیوی نہیں ماننی، بچے ساتھ نہیں دیتے، بہرہ دہری اتفاق نہیں کرتی۔

اس بارے میں میں اپنے خیالات کا اظہار رائے آئندہ کسی موقع پر کروں گا۔